ڈاکٹر سلیم سہیل (محمد اقبال)
اسسٹنٹ پروفیسر اردو،
ایف۔جی قائد اعظم ڈگری کالج، سیکیم تھری، چکلالہ کینٹ، روالپنڈی

طلسمانہ (Fantasy) کیا ہے؟

Fantasy is a way of making the unreal and the imaginary seem as if all fantastical appearances were a part of life, exactly as dreams are a reality but take place on a plane which has no tangible existence.

Urdu dastans are steeped in fantasy but when the progressive movement in literature became a sort of norm, fantasy was sidelined. However, a fresh critical appraisal of fantastic literature has enabled us to look at fantasy from a more sympathetic perspective.

طلسمانہ:

اچھے بھلے لوگ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ طلسمانہ (Fantacy) محض ایک ادبی یا نیم ادبی صنف ہے، ایک طرح کا دل بہلاوا، ایک خیالی دنیا جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلا نکتہ تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو بات انسانی ذہن میں آ گئی اور وہاں سے تقریر و تحریر یا رنگ و آہنگ میں منتقل ہو گئی وہ غیر حقیقی نہیں رہی۔ دوسری بات جو اور بھی زیادہ اہم ہے یہ ہے کہ کوئی فرد ایسا نہیں جس کی زندگی میں طلسمانہ کا کا دخل نہ ہو۔ ہم اپنی زندگی کا کم و بیش ایک تہائی حصہ سوتے میں گزارتے ہیں۔ جو بیداری کے عالم میں گزارتے ہیں اس کا بھی صحیح علم نہیں کہ وہ کیا ہے۔ رسولِ کریمؐ نے فرمایا کہ لوگ سو رہے ہیں جب مریں گے تب جاگیں گے۔ قصہ مختصر، زندگی کا تہائی حصہ کم نہیں ہوتا اور ہر آدمی خواب دیکھتا ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انھیں خواب نظر نہیں آتے۔ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ سائنسی تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہم سب سوتے ہوئے خواب دیکھتے ہیں۔ دقت صرف یہ ہے کہ جو خواب ہمیں گہری نیندیں نظر آتے ہیں وہ بالکل یاد نہیں رہتے۔ خواب میں ہم ان لوگوں سے ملتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں جو مر چکے یا جن سے بچھڑے مدتیں ہو گئیں اور جن کی کوئی خیر خبر نہیں۔ خواب میں ہم خود کو مانوس جگہوں پر پاتے ہیں، گو بعض اوقات یہ مانوس جگہیں تبدیلیوں سے خالی نہیں ہوتیں۔ خواب ہی میں ہم ایسی جگہیں دیکھتے ہیں جو ہم نے جیتے جی کبھی دیکھی نہیں۔ یہ مقامات نامانوس ہونے کے علاوہ عجیب و غریب بھی ہوتے ہیں۔ جب یہ ذہن، جو قدرت کی طرف سے ہمیں ودیعت ہوا ہے، ہر رات ہمارے لیے کسی نامعلوم پردۂ سیمیں پر طلسمانہ تخلیق کرتا رہتا ہے تو طلسمانہ کو حقیقت کی ایک اور سطح کیوں نہ تصور کیا جائے؟

ادب اور طلسمانہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب کے دو قدیم ترین اور اعلیٰ نمونوں یعنی گل گامیش اور ہومر کی اودیسی میں ہم جا بجا طلسمانہ کے دوچار ہوتے ہیں۔ طلسمانہ کا پرانے وقتوں سے رواج ہے۔ سائنس فکشن ایک نئی صنف ہے اور اس کا آغاز انیسویں صدی میں سائنس کی روز افزوں اہمیت کے ساتھ ہوا۔ بعض اوقات طلسمانہ اور سائنس فکشن میں

فرق کرنا آسان نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ طلسمانہ میں سب کچھ ممکن ہے۔ تخیل کو بے مہار آزادی میسر ہے۔ مستند سائنس فکشن میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جو آج ممکنات میں سے نہیں وہ آنے والے برسوں یا صدیوں میں حقیقت کا روپ دھار لے گا۔ طلسمانہ کو ممکن سے واسطہ نہیں۔ اس لحاظ سے طلسمانہ کی کوئی جامع تعریف ممکن نہیں رہتی۔ صرف اس کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

جو فکشن بظاہر حقیقت پسندانہ معلوم ہوتا ہے اس میں بھی کچھ نہ کچھ طلسمانہ پہلو موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً ''فسانۂ آزاد'' میں آزاد کی ترکی جا کر روس کے خلاف جنگ میں حصہ لینا ایک طرح کا طلسمانہ ہے۔ پہلے طلسم کشا طلسم فتح کرنے نکلتے تھے اور ان پر کئی حسینائیں عاشق ہو جاتی تھیں۔ سرشار اپنی ظاہری حقیقت پسندی کی بنا پر طلسمی داستان نہیں لکھ سکتے تھے۔ لیکن آزاد اور خوجی کی صورت میں انھوں نے امیر حمزہ اور عمر و عیار کو بطرزِ دیگر پیش کیا ہے۔ آزاد پر بھی کئی یورپی حسینائیں فریفتہ ہو پاتی ہیں۔

طلسمانہ کے بارے میں سب سے بہتر بات جو کہی گئی ہے یہ ہے کہ جب اس کا پس منظر ہماری دنیا ہو تو اس میں جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں وہ یہاں پیش آنا ناممکن ہیں۔ جب کسی اور دنیا کا ذکر ہو تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ایسی دنیا سردست ناممکن ہے چاہے اس خیالی دنیا کے سیاق و سباق میں بیان کی ہوئی کہانی وحدت کی حامل کیوں نہ ہو۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے فکشن میں طلسمانہ کے عناصر ہر طرف نظر آتے ہیں کیوں کہ سائنسی ایجادات، تبدیلیوں اور دریافتوں کی وجہ سے لکھنے والے ہمیشہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ کیا حقیقت ہے اور کیا فریب یا واہمہ ہے۔ ناول چاہے محاکاتی یا حقیقت پسندانہ کیوں نہ ہو اس میں غیر حقیقی عناصر داخل ہوتے رہتے ہیں۔ جیمز جوائس ہو یا ٹامس مان یا کافکا یا پچھلی چند دہائیوں میں سامنے آنے والے وسطی اور جنوبی امریکا کے جادوئی حقیقت نگار، سب بہ یک وقت دو دنیاؤں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایک جو حقیقت پسندانہ اور جانی پہچانی ہے اور دوسری جو خواب آلودہ اور غیر حقیقی ہے۔ اندازہ ہے کہ حقیقت اور فریب کا باہم دگر اثر انداز ہونا آنے والے وقت میں بڑھتا چلا جائے گا۔ فی الواقع حقیقت (Virtual Reality) میں آنے والے دور کی جھلک نظر آتی ہے۔

اردو کی تنقیدی تاریخ میں ادبی اصطلاحات کے بیان سے لے کر ان کی شرح تک جو اغماض برتا گیا اس کی مثال دنیا کی کسی دوسری زبان و ادب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اردو کی ادبی تاریخ کا باضابطہ آغاز اگر سترھویں صدی سے کیا جائے تو آغاز سے لے کر تا حال اس امر کی اہمیت کو نہیں سمجھا گیا کہ علوم کی دنیا میں اصطلاح کا کیا مقام ہے۔ جن زبانوں کے ادب میں اصطلاحات شامل رہیں وہ آج کس مقام پر ہیں۔ اس کی بیّن مثال یونانی ادب کی ہے کہ اپنے آغاز سے ہی لکھنے والوں کی بالغ نظری نے ہوا میں تیر نہیں چلائے بلکہ ہر مظہر کی شرح و بسط میں توازن اور اعتدال کا ثبوت دیتے ہوئے مظاہر کو ان کے نام دیے ہیں۔ اصطلاح نام ہی تو ہے۔ کسی بھی ادبی اقلیم میں داخل ہونے کا ایک راستہ، ایک طرح کی کنجی کسی بھی علمی معاملے کو سلجھانے کی۔

''جس طرح چھوٹی سیپ میں سمندر کی صدائیں گونجتی ہیں اس طرح علمی اصطلاحیں اپنے اندر تصورات اور

افکار کی گونج کو سمیٹے ہوئے ہوتی ہیں۔اصطلاحات علوم کی زبان ہیں۔ اگر ان کا فہم ہوتو علم حاصل ہوتا ہے اورفہم نہ ہوتو علم سطحی رہتا ہے'' (۱)

بہ ہر حال یہاں جس اصطلاح سے تعارف مقصود ہے وہ طلسمانہ سے متعلق ہے ۔جس کا بیان اردو ادب میں نہ ہونے کے برابر ہے اور اس کی ذمہ داری اردو زبان و ادب کے خدمت گزاروں پر برابر آتی ہے۔

اردو میں کسی بھی انگریزی اصطلاح کے بیان کا رائج طریقہ یہ ہے کہ جتنی بھی لغات ہیں انھیں اکٹھا کیا جاتا ہے اور ان لغات میں سے مطلوبہ اصطلاح کو پہلے انگریزی میں لکھ کر بعد میں اس کا کچاپکا ترجمہ کر دیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ گویا اصطلاح کے بیان کا بوجھ سر سے اتر گیا مگر یہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں ہے۔اصطلاحیں علوم کے باطن میں اتنی پیوست ہوتی ہیں کہ انھیں بغیر کسی سیاق و سباق کے بیان نہیں کیا جاسکتا ۔ ادبی اصطلاحات کے بیان میں منتخب ادبی اصطلاحات کے مؤلفین نے اس بات کا خیال رکھا ہے اور زبان وادب کے ماضی و حال اور مستقبل میں اس اصطلاح کے امکانات کی سمت نمائی کی ہے۔ یہاں اس بیان کی روشنی میں ایک اصطلاح ایکٹact کے حوالے سے بیان میں اختصار اور جامعیت دیکھتے ہیں :

''ڈرامے کو جن بڑے بڑے حصوں یاابواب میں تقسیم کیا جاتا ہے انھیں ایکٹ کہتے ہیں۔ قدیم یونانی ڈراموں میں ایکٹ کا تصور موجود نہیں۔ اغلب ہے کہ نشاۃ الثانیہ کے دوران میں قدیم ڈراما نگار سینیکا (۴ق م۔۶۵ء) کے زیر اثر یورپی ملکوں میں ڈرامے کو پانچ حصوں میں بانٹنے کا رواج پڑا۔ پانچ حصوں کی یہ تقسیم مدتوں چلی۔ آخر انیسویں صدی میں جب پرانی روایتوں کی گرفت ڈھیلی پڑی تو اس پابندی سے نجات مل گئی۔ چار اور تین ایکٹ کے ڈرامے لکھے جانے لگے ۔ اب ایک اور دو ایکٹ کے ڈرامے بھی عام ہیں ۔ڈراما کتنے ایکٹ پر مشتمل ہونا چاہیے ،اس کا کوئی اصول نہیں ۔ یہ تقریباً مکمل طور پر ڈراما نگار کی مرضی ہے کہ وہ اپنے ڈرامے کو کتنے حصوں یا ابواب میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔'' (۲)

یہاں پر ہم نے دیکھا کہ ایکٹ کے حوالے سے کس اختصار اور ابلاغ کے حامل ایک اقتباس میں ایکٹ کا نظری اور عملی حوالہ سامنے آیا۔ ادبیات عالم میں طلسمانہ کا آغاز تخلیق ادب کے ساتھ ہی ہوگیا تھا ۔گل گامیش کی داستان اس کی عمدہ مثال ہے مگر اس اصطلاح کا اردو میں بھرپور تعارف نہیں کروایا گیا۔

طلسمانہ کا اگر انسانی زندگی میں حصہ نکالا جائے تو شاید بہت زیادہ ہو۔ہمیں زندگی میں دن رات دو چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک تو زندگی کے حقائق ہیں اور دوسرے خواب۔یعنی زندگی حقیقت اور خواب کے ادغام سے اپنا چہرہ بناتی بگاڑتی ہے اور طلسمانہ کی اصل اگر دیکھی جائے تو دو چیزیں بہت متحرک نظر آتی ہیں: حقیقت اور خواب۔ضرورت اس امر کی تھی کہ حقیقت یا خواب کو کیسے دکھایا جائے تو طلسمانہ کا سہارا لیا گیا۔حقیقت اپنی سطح پر پیچیدہ عنصر ہے اور خواب اپنے اعتبار سے گنجلک۔ دونوں کی اپنی اپنی محدودات ہیں۔ دونوں کے اپنے اپنے اختیارات ہیں۔ دونوں کا تعلق الگ الگ دنیاؤں سے ہے۔ مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا کہ خواب اور حقیقت ایک دوسرے سے فاصلے پر رہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ

حقیقت خواب بن جاتی ہے اور خواب حقیقت کا روپ دھار لیتے ہیں۔ جہاں حقیقت اور خواب کا ادغام ہوتا ہے وہیں طلسمانہ کی سرحدیں اپنی پوری وسعت کے ساتھ دامن پھیلائے خیرمقدم کرتی نظر آتی ہیں۔ اگر خواب کی طاقت انسانوں کے پاس نہ ہوتی تو زندگی ایک جیسی عادات کو دہرانے کی بے مزہ سرگرمی بن کے رہ جاتی۔ یہ خواب ہی ہیں جو زندگی کو کروٹ دیتے ہیں۔ کچھ نیا سرانجام دلوانے کی سبیل کرتے ہیں۔ روکھی پھیکی زندگی میں خوشی کا بیج ڈالتے ہیں جس سے پھوٹتے والی کونپل حسن کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہے۔طلسمانہ جامد زندگی کا پرچار نہیں کرتا۔طلسمانہ حرکت کا دوسرا نام ہے۔ آپ زندگی میں حرکت اور تنوع کو نکال کر دیکھیں، حاصل جمع صفر نکلے گا۔تکرار کسی بھی کام میں قابل ستائش عنصر نہیں ہوتا۔طلسمانہ تکرار کو ختم کرتا ہے، جمود کو توڑتا ہے۔طلسمانہ انسانی تخیل میں ہوا کے تازہ جھونکے کی مانند ہے جو باطنی حبس سے نجات کا ذریعہ بنتا ہے۔

> Fantasy, or phantasy,replies auntie,clearing her throat , is from the greek paraolalit, "a making visible,, ...or in greek to imagine , hare visions, 'and to show'. And she summarizes the older uses of the word in English: An appearance, a phantom, the mental process of sensuous perception, the faculty of imagination, a false notion, caprice or whim.(3)

مندرجہ بالا تعریف کے حوالے سے ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہم اپنے محدود مآخذ کی روشنی میں بعض اصطلاحات کا دائرہ کتنا تنگ کر دیتے ہیں یعنی اردو ادب میں طلسمانہ کی اصطلاح صرف خوابوں اور جنّوں بھوتوں کی کہانیوں کے حوالے سے جانا جاتا ہے مگر اصلاً اگر دیکھا جائے تو سارے کا سارا ادب ہی اس اصطلاح کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔یعنی طلسمانہ چیزوں کو دکھانے کے قابل بناتا ہے اور قدیم یونان میں وسعت نظری اور کچھ ظاہر کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔یعنی زبانیں جیسے جیسے اپنا ارتقائی سفر طے کرتی جاتی ہیں ساتھ ساتھ ان کے حوالے سے وابستہ تصورات بدلتے چلے جاتے ہیں اور نئے نئے معانی ان میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ خیال جب اپنا چہرہ دکھاتا ہے تو ضروری نہیں کہ ہمیشہ اس میں مافوق الفطرت عناصر کا دخل ہو۔ خیال پر حد نہیں لگائی جاسکتی۔ خیال کا تعلق ہماری روزمرہ کی حقیقی زندگی سے بھی ہوسکتا ہے۔طلسمانہ، جو خیال ہی کی ایک صورت ہے، لازم نہیں ہمیشہ اپنا تعلق ماورائی دنیا سے قائم رکھے۔طلسمانہ عناصر کی مدد سے ہم اس چلتی پھرتی زندگی کی تصویریں بنا سکتے ہیں۔ زندگی کی بگڑتی ہوئی شکل میں سلجھاؤ کی صورت نکال سکتے ہیں۔ اپنی فہم اور نظر میں وسعت لا سکتے ہیں۔

ہم اپنے تمام امورِ زندگی، ذہنی وسعت یا ذہنی تنگی سے بناتے، بگاڑتے ہیں۔ خیال ذہن کا زائدہ ہوتا ہے۔طلسمانہ خیال کو جلا بخشتا ہے اور اسی جلاؤ میں فرد آسودگی کی سبیل کرتا رہتا ہے۔طلسمانہ مافوق الفطرت اجزا پر مشتمل ہوتا ہے مگر اس کا پیغام مافوق الفطرت نہیں ہوتا۔ اس میں ماضی، حال، مستقبل سے ورا بھی وقت کی کئی سطحیں ہوتی ہیں۔

اُرسلا کے لی گوین اس اصطلاح کا انگریزی پس منظر بیان کرتی ہیں۔ یعنی ایک مظہر، پرچھاواں، احساسات کی ترنگ ،ذہنی استعداد ایک غلط نظریہ، ذہنی انتشار۔اب ایک اصطلاح اپنے باطن میں کتنی مختلف دنیائیں لیے ہوئے ہے جو

بہ ظاہر ایک جیسی محسوس ہوتی ہیں۔طلسمانہ کے ضمن میں اگر دیکھا جائے تو یہ ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کی صورت حال ہے۔آپ اگر اپنے ذہن میں تصویر بناتے ہیں تو یہ عمل طلسمانہ کی ذیل میں آتا ہے مگر جب عملی حوالے سے اس تصویر کا حقیقت میں کوئی روپ دیکھنا چاہتے ہیں تو مایوسی ہوتی ہے۔یعنی یہ حقیقت اور خواب کے درمیان آنکھ مچولی کھیلتا رہتا ہے اور زندگی گزرتی رہتی ہے ،ایک ہی وقت میں مستعد بھی ہے اور منتشر بھی ہے ۔ اس استعداد اور انتشار سے کہانیاں بُنتے رہتے ہیں اور لوگ انھیں پڑھے جا رہے ہیں ۔لمحہ موجود میں جے کے رولنگ کے ناول ہیری پوٹر طلسمانہ کی مقبولیت کی نادر مثالیں ہیں ۔

اُرسلا کے لی گوین ،ایک طلسمانہ فکشن کے انتخاب میں ،طلسمانہ کا تعارف کراتے ہوئے مزید وضاحت کرتی ہیں کہ اس عمل کے ذریعے چیزوں کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑا جاتا ہے یعنی فرد اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے کبھی اپنے شاندار ماضی کو یاد کرتا ہے تو کبھی تابناک مستقبل کے محل سجا لیتا ہے۔ یہ عمل اسے روحانی و نفسیاتی تشفی پہنچاتا ہے۔اس میں فرد چیزوں کو شکست و ریخت کے عمل سے گزارتا رہتا ہے اور چیزیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں۔کبھی اسے مطلوبہ اقلیم میں داخلے کی اجازت ملتی ہے اور کبھی مایوس لوٹنا پڑتا ہے۔ انسان اپنے داخل میں خود کو جوڑتا رہتا ہے ۔منتشر خیالات میں کھویا رہتا ہے جن کا کوئی حقیقی وجود بھی نہیں ہوتا۔طلسمانہ ایک طرح کا کولاژ ہے جس میں شان وشکوہ ، وسعت نظری ، غلط نظریات ،حسین تصورات ،خواب ،حقائق ،شکوک وشبہات ،طلسم ،چھوٹے چھوٹے نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔

ماریو برگس یوسا نے اپنی کتاب'' نوجوان ناول نگار کے نام خط''جس کا ترجمہ محمد عمر میمن نے کیا ہے،طلسمانہ کے بارے میں بعض جگہوں پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

> ''اس میں شک نہیں کہ جب کوئی شخص .....مثلاً دون کیہوتے یا مادام بوواری .....فکشن کو حقیقی زندگی سے خلط ملط کرنے پر اصرار کرتا ہے اور اس بات کی کوشش کہ زندگی فکشن سے ملتی جلتی ہو، تو نتائج تباہ کن ہو سکتے ہیں۔'' (۴)

> ''شاید سب سے ممتاز اور واضح طور پر متباین اختیارات ''حقیقی ''دنیا اور ''فنتاسی'' (Fantastic)دنیا ہے۔'' (۵)

> ''تو اب یہاں ہمارے سامنے نقطۂ نظر کی دو مثالیں جن میں حقیقی اور فنتاسی کے درمیان ایک تعلق پایا جاتا ہے۔ یہ مخالفت ایک طرح کا بنیادی تضاد ہے جو اس صنف کا مابہ الامتیاز ہے جسے ہم فنتاسی کہتے ہیں.....اگر ہم اس نقطہ نظر کی چھان بین اپنے وقت کے فنتاسی ادب کے ممتاز ترین مصنفین (ایک سریع فہرست بہم پہنچانے کے لیے بوہیس ،کورتا زار، کال وینو،رولفو، پیئر دمند یارگ ،کافکا،گارسیامارکیز،ایلخو کار پین تیئر کے نام لیے جا سکتے ہیں) کی نگارشات میں کریں تو معلوم ہوگا کہ ان دو الگ تھلگ کائناتوں کو اکٹھا کرنا.....حقیقی اور غیر حقیقی یا فنتاسی، جس طرح راوی اور بیانیے نے ان کی تجسیم یا نمائندگی کی ہوتی ہے.....یہاں تک یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ فنتاسی ادب کے کسی لکھنے والے کی خلاقیت کا انحصار سب سے پہلے

اس طریقے پر ہوتا ہے جس کے ذریعے سطح حقیقت کے اعتبار سے نقطہ نظر اس کے فکشن میں اظہار پاتا ہے۔'' (۶)

''اختتاماً ، میں تمھیں فنتاسی ادب کا ایک نظریہ یاد دلانا چاہتا ہوں جسے عظیم فرانسیسی اور بیجین نقاد اور انشاء پرداز روژے کائل لووا نے (اپنی ''انتولوڈی دیو فانتاستیک کی تمہید میں'') پیش کیا ہے۔ بہ قول کیلوس، حقیقی فنتاسی ادب دانستہ پیدا نہیں کیا جاتا؛ یہ کسی ادیب کی شعوری کاوش کا نتیجہ نہیں ہوتا جو فنتاسی قصہ لکھنے کھڑا ہو۔ کیلوس کے خیال میں حقیقی فنتاسی ادب ناقابل یقین، حیرت انگیز، محیر العقول، عقلی اعتبار سے ناقابل تشریح افعال، جن کی پیش اندیشی نہ کی گئی ہو اور جو غالباً لکھنے والے کی توجہ میں نہ آئے ہوں کے برجستہ الہام کا حاجت مند ہوتا ہے۔.....آدمی کہہ سکتا ہے کہ یہ ایسا ادب ہے جو ''موتو پروپریو motuproprio'' کے قالب میں نمودار ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، یہ فکشن فنتاسی کہانیاں نہیں بیان کرتے ہیں؛ یہ بذات خود فنتاسی ہیں۔'' (۷)

طلسمانہ، طلسمانوی ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ان سب میں بہت پیچیدگیاں ہیں۔ چھلاوے کی سی کیفیات ہیں۔ طلسمانہ چھپن چھری ہے۔ جس میں کئی ابہام ہیں ، بے وقوفیاں ہیں ، دھوکے ہیں اور دماغ کی پیچ کھاتی ہوئی حالتیں ہیں ۔ طلسمانہ کا سفر سیدھا سفر نہیں ہے کہ آپ ایک ہی ڈگر پکڑیں اور آپ کو منزل مل جائے، یہاں تو کئی بن باس، کالے کوس کاٹنے پڑتے ہیں اور کسی سراب کے سہارے سفر طے کرنا پڑتا ہے ۔ سراب چونکہ طلب کو ظاہر کرتا ہے اور طالب پر واجب ہے کہ اس کا پیچھا کرے اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا مطلب ہے کہ طلب صادق نہیں ہے۔ طلسمانہ میں بھی چاہتے نہ چاہتے ہوئے دھوکہ کھانا پڑتا ہے۔ سراب کا پیچھا کرنا پڑتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس تمام کشٹ کے بعد گوہرِ مراد ہاتھ آ جائے۔ بعض اوقات تو خیال کا سفر سراب سے سراب تک کا سفر بن جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ آپ جو جس طرح کرنا چاہیں، کرنے بیٹھیں تو اسی طرح انجام کو پہنچ جائے۔ خیال ایک تسلسل کا نام ہے جس میں واقعات کی تان صاحبِ خیال کو کبھی طمانیت پہنچاتی ہے اور کبھی بے زار کر دیتی ہے۔ مگر سفر لازم ہے۔ خیال لازم ہے۔ آپ کچھ سوچو گے تو پاؤ گے۔ تبدیلی اس وقت تک نہیں آ سکتی جب تک انسان تبدیلی کے خیال کو ذہن میں نہیں لاتا۔ طلسمانہ نقش گر ہے۔ تصور بناتا بھی ہے اور مٹاتا بھی ہے۔ مگر یہ سب ایک خواب جیسی بے اختیاری میں ہوتا ہے۔ ایسے جیسے ذہنِ انسانی پر کوندہ لپک جائے۔ کسی کھڑکی کا پٹ جو ہوا کے زور سے بند ہو کر ایک لمحے کے لیے مبہوت کر دیتا ہے۔ ایک زلزلہ جس سے آدمی لرز کے رہ جاتا ہے۔ یہ سبھی ذہن کی صورتیں ہیں اور طلسمانہ انھی اشکال میں اپنا وجود ثابت کراتا رہتا ہے۔

اب اردو لغات میں طلسمانہ کی تعریف دیکھئے اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت کے مطابق :

۱ خیال ،صورت گری ، ایجادی قوت، اختراع کا مادہ

۲ انوکھا ذہنی نقش ، نیا تخیل ، جاگتی آنکھوں کا خواب ،واہمہ

۳ انوکھی طرز کی اختراع (۸)

جامع انگلش اردو ڈکشنری کے مطابق :

۱ فنطاسیہ، سراب خیال

۲ واہمہ، ذہنی شبہ

۳ قوت متخیلہ ،قوت واہمہ

۴ انوکھی وضع

۵ تصور، غیر موجود یا معدوم اشیا کی ذہنی خاکہ کشی (۹)

قومی انگریزی اردو لغت کے حوالے سے:

''سراب خیال،فنطاسیہ، بے لگام تخیل کی تخلیق ،بار بار نگاہوں کے سامنے آنے والا خیال یا اختراع، واہمہ، قوت واہمہ، ذہنی تصور خصوصاً جب وہ مضحکہ خیز یا عجیب وغریب ہو'' (۱۰)

یہاں ایک بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ تمام مرتبین نے بالترتیب ایک دوسرے کی اطاعت میں وہی مطالب درج کیے ہیں جو ۱۹۹۵ میں حقی صاحب نے بیان کیے تھے۔ جامع انگلش اردو ڈکشنری۱۹۹۸میں چھپی اور قومی انگریزی اردو لغت ۲۰۰۲میں چھپی۔ یہاں پہلی رائے ،جس کی اطاعت کی گئی ہے، کو دیکھا جائے تو خیال سے مراد کونسا خیال، صورت گری سے مراد کیسی صورت گری۔ ایجادی قوت تو کون سی ایجادی قوت غرض ان تعریفوں میں تکرار بہت زیادہ ہے، یہاں تو یہ التزام نظر آرہا ہے کہ بہت سے مطالب قاشوں کی صورت میں لکھ دو،کوئی ایک تو درست ہوگا۔اس سب کی کچھ وجوہات ہیں ۔مرتب جب لغت مرتب کرتا ہے تو وہ جس زبان کی لغت مرتب کر رہا ہوتا ہے، اس میں مطلوبہ لفظ کی جڑیں تلاش کرتا ہے۔ ظاہر ہے لفظوں کا بھی خاندان ہوتا ہے۔ اگر کوئی اجنبی لفظ درآئے تو اس کی وضاحت کے لیے اس زبان سے رجوع کیا جانا چاہیے ،جس زبان سے وہ لفظ آیا ہے۔تو مسائل کس قدر کم ہو جائیں گے۔ ہاں اگر لفظ کو کلیت سمجھ کر قیاسی تعبیر کریں گے تو وہ کبھی اپنی اصل صورت نہیں بتا پائے گا۔ اردو میں انگریزی الفاظ کے ساتھ یہی کچھ ہوا ہے کہ زبان کا سیاق وسباق جانے بغیر اگر کسی لفظ کو بیان کیا جائے گا تو سہو کے امکانات زیادہ ہوجاتے ہیں۔بہتری اسی میں ہے کہ مدون دونوں زبانوں سے واقفیت حاصل کرے۔

مگر یہاں ہماری دلچسپی کا علاقہ طلسمانہ سے ہے۔ یہاں تک چند باتیں واضح ہوئی ہیں کہ طلسمانہ یونانی لفظ ہے ،جس کا مطلب ہے چیزوں کو دکھانے کے قابل بنانا۔ اب کسی چیز کو کیسے دکھانا ہے ،اس بات کا انحصار طلسمانہ لکھنے والے پر ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ کہیں خواب اور حقیقت کے سنگم پر کھڑی ہے ۔تیسری بات یہ ہے کہ طلسمانہ کے ذریعے فرد خود کو چیزوں کے ساتھ جوڑتا ہے۔ ایک رشتہ قائم کرتا ہے۔ اپنے آپ کو زندگی کے ساتھ جوڑتا ہے۔ چوتھا نکتہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں صرف سکھ ہی سکھ تو نہیں ہیں، دکھ بھی ہیں تو طلسمانہ انسانی دکھوں پر پھاہا رکھتا ہے۔ اس کے غم کا ساتھی بنتا ہے یعنی اسے اگر حقیقت میں کچھ حاصل نہیں ہو رہا تو طلسمانہ اسے خوابوں کی دنیا میں سب کچھ عطا کر دیتا ہے۔مگر اس عطا

کا طریقہ میکانکی ہرگز نہیں۔ پیش بینی سے طلسمانہ کو کد ہے۔ منصوبہ بندی کبھی بھی اس صنف کا حصہ نہیں رہی۔ یہاں زیادہ زور شعور کی رو کا چلتا ہے۔ فرد کا سارا لیکھا اسی رو میں چھپا ہے۔ خیال پر کسی طرح کی کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی۔ آپ اپنے ذہن پر پابندی نہیں لگا سکتے کہ وہ اس خیال کو سوچے، اس خیال کو سوچ کے پاس نہ پھٹکنے دے۔ یا یہ خیال نیک ہے یا بد ہے۔ یہ خیال رہ نمائی کرتا ہے، یہ خیال گمراہ کن ہے۔ نیکی والے، رہ نمائی والے خیال اچھے ہوتے ہیں لہٰذا ذہنِ انسانی کو انھی خیالات کو جگہ دینی چاہیے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ذہن آزاد ہے اور وہ اپنی ترنگ میں چلتا جا رہا ہے۔ طلسمانہ اسی ترنگ کی کسی کروٹ کا نام ہے جو ہمیں خیال کی نزول صورتوں سے واقف کراتا ہے اور ہم کچھ نہ کچھ باطنی دنیا میں جھانکنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ورنہ تو اندر کی سیاحت ناممکنات میں سے ایک ہے۔ طلسمانہ میں پلک جھپکنے میں آدمی کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔

یہ ایک حوالے سے فرد کی نفسیاتی الجھنوں کو سلجھاتا ہے۔ اس کی تحلیل نفسی کرتا ہے۔ اور ہر مشکل بلکہ ناممکن مقامات پر اس کے لیے سکھ اور آسائشات کا سامان کرتا ہے۔ یہ محض خیالی محلات نہیں بلکہ اس میں انسان کے لیے راحت کے کچھ در ہمیشہ وا رہتے ہیں۔ یہ انسانی باطن میں تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح آتا ہے اور وہ سب غم بھول جاتا ہے، جو فی زمانہ ایک بڑی خدمت ہے اور لمحہ موجود کے انتشار، دہشت، خوف اور کرب کا سب سے بڑا علاج۔ کیا وجہ ہے کہ ہیری پوٹر خریدنے کے لیے بک سٹورز پر لائنیں لگ جاتی ہیں ۔ یہ بات سوچنے کی ہے کہ اکیسویں صدی کے عقلیت پرست معاشرے میں خواب اتنی مقبولیت اختیار کر گئے تو اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ انسان نے عقل سے بہت دکھ اٹھا لیے، اب وہ کوئی تسلی چاہتا ہے۔ وہ خواہش کرتا ہے کہ اس کے زخموں پر کوئی مرہم رکھے۔ یہ کام طلسمانہ نہایت عمدگی سے کرتا ہے۔

ہمارا معاشرہ اس نہج پر چلنا شروع کرتا ہے کہ ہمارے نقاد ہمیں یہ کہہ کر مایوس کر دیتے ہیں کہ یہ خیالی باتیں ہیں۔ یہ کارِ بے کاراں ہے، بھلا حقیقت سے اس کا کیا تعلق؟ اپنے بچوں کو جنوں بھوتوں کی کہانیاں پڑھا کر ان کا مستقبل تاریک نہ کرو۔ انھیں کوئی نہیں سمجھاتا کہ یہ بچوں کو لاشعوری طور پر پختہ بنائیں گی۔ یہ کہانیاں ان کے اذہان کو بلوغت دیں گی۔ ان کے اذہان کو تخلیق کی طرف لے جائیں گی۔ وہ ایجادات کر سکیں گے۔ یہ تمام ایجادات کو اگر دیکھا جائے تو یہ واہمہ ہی تو تھیں جسے بعد میں حقیقت کا روپ ملنا نصیب ہوا اور وہ ایجادات آج انسان کی زندگی میں انقلاب لے کر آئی ہیں۔

طلسمانہ میں قدم قدم پر دماغ عجائبات کا سامنا کرتا ہے۔ طلسمانہ میں ذہن پہلے کسی مظہر کی تصویر بناتا ہے، جو اپنے خیال کی حد تک بہت خوبصورت، دل کو ڈھارس بندھانے والا اور اس کی نا آسودگی کو راحت میں بدلنے کا وسیلہ ہوتا ہے مگر جب اس تصویر کو حقیقت میں بدلنے کا لمحہ آتا ہے تو وہ خیال ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ ساتھ نہیں دے سکتا یہ معاملہ ہو جاتا ہے:

عالم کسو حکیم کا باندھا طلسم ہے

ایک طلسمی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ طلسمانہ نئے نئے تصورات سجھاتا ہے، جو انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں میں سلجھاؤ لے کر آتے ہیں۔ طلسمانہ کا اور انسانی نفسیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ انسان، جو لاشعوری طور پر اپنے خوابوں اور خیالوں

کا قیدی ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خود ہی خود میں ٹوٹتا بنتا رہتا ہے اور اس کی یہ توڑ پھوڑ اس کی ذات کی تعمیر نو میں بڑی مدد ثابت ہوتی ہے۔ اس کے باطن میں چلنے والے آروں سے اگر کوئی چیز بچاتی ہے تو وہ خواب ہی ہیں۔ سہانے خواب، کرب میں مبتلا کر دینے والے خواب۔

طلسمانہ کا سب سے بڑا احسان ہم پر یہ ہے کہ اس کی مدد سے ہم اس دنیا کا جو اپنے ظاہر میں ایک ہے کسی دوسری دنیا سے تقابل کر سکتے ہیں۔ظاہر ہے یہ دنیا تو ایک ہے، اس کے متوازی اپنے داخل میں کوئی دوسری دنیا بسانی پڑے گی، جو اس سے بعض صورتوں میں مختلف ہوگی۔ طلسمانہ فکشن کے ایک انتخاب میں انتھالوجی کے مدوّن ایرک ایس۔ راب کن لکھتے ہیں۔

> The problem with the real world, frankly, is that it is the only one we have. To be sure, the real world is not an intolerably restricted world, at least not for most of us in the industrialized nations with our jet travel and air conditioning and long -distance tele phone communication, but once you have been frisked at airport security a few times or have paid those ever-rising electric bills or have been called out of the bath by enough wrong numbers, you might well prefer a flying carpet are change less cockaigne or telepathy. Where do you find them? In fantastic worlds. (11)

مدون اس بات کو تسلیم کر رہا ہے کہ حقیقی دنیا ایسی بھی نہیں کہ یہ بالکل نا قابل برداشت حد تک پابندیوں سے بھری ہوئی ہو۔ ہاں مگر اس صورت میں جب اس ایجادات سے بھری ہوئی دنیا میں، جب جہاز میں بٹھانے سے پہلے سختی سے تلاشی لی جائے یا بجلی کے بڑھے ہوئے بل، ائر کنڈیشنز یہ سب کچھ دستیاب ہیں مگر کہیں بھی آپ کو فوری دستیابی میں کوئی رکاوٹ پیش آتی ہے تو آپ خود کو اگر کسی چیز کی دستیابی سے مخصوص کرنا چاہتے ہو تو وہ سب کچھ آپ کو خیالوں کی دنیا میں ملے گا۔ یعنی خیال آپ کو اس ایجاد سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرے گا۔ ان تمام ایجادات کی معنویت اپنی جگہ پر قائم و دائم ہے مگر اگر کسی کے پاس یہ سب کچھ نہیں اور یقیناً ہمارے جیسے پسماندہ معاشرے میں تو بالکل نہیں تو خواب فرد کا ساتھ دیتے ہیں۔انسان جب اپنے ارد گرد پتوں کی طرح بکھری لاشیں اور بم سے اڑے ہوئے چیتھڑے دیکھتا ہے تو اس کی حالت متوازن نہیں رہتی۔اس کو اگر اس کرب ناک فضا سے کوئی چیز نکال سکتی ہے تو وہ صرف طلسمانہ ہے، جس کی تخلیق اردو ادب کے موجودہ منظر نامے میں بالکل نظر نہیں آتی ہے۔

انگریزی لغات کی روشنی میں طلسمانہ:

> "Chamber's 20th century Dictionary"
>
> "A film, a story etc, not based on realistic characters or settings, preoccupation with thoughts associated with unobtainable desires.(12)
>
> "The Oxford English Dictionary"

"Imagination' the process or the faculty of forming mental representations of things not actually present." (13)

"Cambridge International Dictionary of English"

"A pleasant situation that you enjoy thinking about, but which is unlikely to happen or the activity of thinking itself." (14)

"A Dictionary of Literary Terms"

"Fantasy literature deals with imaginary worlds of fairies, dwarves and other non-realistic phenomena" (15)

"A hand Book of Literature"

"Fantasy usually employed to designate a conscious breaking free from reality. The term is applied to a work that takes place in a nonexistent and unreal world, such as fairyland or concerns incredible and unreal characters or employs physical and scientific principles not yet discovered. Fantasy may be employed merely for a whimsical delight of author or reader or it may be the means used by the author for serious comment on reality.(16)

"Encyclopedia Britannica"

" Imaginative fiction dependent for effect on strangness of setting and of characters e.g.

1. William Shakespear's "A Midsummernight's Dream"
2. Jonathan Swifft's "Gullivers Travels"
3. T.H. White's "The Once and Future King"

"Encyclopedia of World Literature"

"The term fantasy fiction refers to a specialized type of romance story on which the characters are idealized heroes and villains and the settings remote and exotic.Such fiction tends to make free use of magic and enchantment as well as other non-rational or supernatural forces and imagery in a way designed to evoke dream like atmosphere ….. (17)

یہ بات غور طلب ہے کہ اردو کا کلاسیکی سرمایہ تو داستانوں کی صورت میں طلسمانہ کا پرچار کرتا نظر آتا ہے لیکن جدید ادبی متون میں طلسمانہ بالترتیب کم ہوتا نظر آتا ہے۔ اس کے بہت سے محرکات ہو سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بیسویں صدی کی ایجادات اور سائنسی طرز فکر نے معاشرے میں تعقل کے عمل دخل کو زیادہ کیا۔ اگر دیکھا جائے تو بیسویں صدی میں دو جنگوں اور اگر برصغیر کی تاریخ دیکھی جائے تو تقسیم کے کرب میں ٹوٹے ہوئے لوگوں کو طلسمانہ میں پناہ لینی چاہیے

تھی۔ مگر یہاں صورت حال الٹ ہے۔ ہاں اگر داستان امیر حمزہ کو لیا جائے تو اس کی تخلیق کا زمانہ پہلی جنگ عظیم کے ساتھ کا ہے مگر بعد میں منظر ایک دم صاف ہو گیا۔ اردو کے جدید ادب میں کرشن چندر ،اشفاق احمد، محمد خالد اختر ،حجاب امتیاز علی کی بعض کہانیوں اور ناولوں میں اس طرز احساس کا اظہار ملتا ہے۔ کرشن چندر کی ''ایک وائلن سمندر کے کنارے''، ''ایک گدھے کی سرگزشت''، ''گدھے کی واپسی''، ''ایک گدھا نیفا میں''۔ نسیم حجازی، احسن فاروقی، محمد خالد اختر کا ناول ''بیس سو گیارہ''۔ اشفاق احمد کا ''طلسمِ ہوش افزا''۔ حجاب امتیاز علی، ''پاگل خانہ''۔ ایس ایم جمیل واسطی، ''پگل کا جزیرہ''۔ تو یہ کوششیں ہیں جو ہمیں اردو ادب میں نظر آتی ہیں، اس کے برعکس مغرب میں سائنس فکشن کی ذیل میں بہت سارا فکشن تخلیق کیا گیا۔

ہمارے ہاں طلسمانہ کے کم ہونے کے پس پردہ محرکات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں زیادہ دخل ہماری ذہنی آرام پسندی کا ہے۔ ظاہر ہے حقیقت کا بیان تو سادہ لفظوں میں ہو جاتا ہے اور اس کے لیے زیادہ ذہنی ورزش کی ضرورت نہیں پڑتی اور مصنف ہونے کا دم چھلہ بھی لگ جاتا ہے۔ مگر طلسمانہ کی تخلیق اتنا سیدھا معاملہ نہیں، یہاں تو دماغ کو کئی پُر پیچ راہوں سے گزرنا پڑتا ہے پھر کہیں جا کے آپ کو منزل مُراد ملتی ہے۔

برصغیر کا دماغ اس ذہنی مشق سے گزرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ہم تحریر میں آسانیاں تلاش کرتے ہیں۔ ہم سے پہلے لوگ لمبی سانس کے مالک تھے۔ محمد حسین جاہ، احمد حسین قمر، منشی تصدق حسین ان لوگوں کی طرف دیکھیں تو انھوں نے کس اعتماد، صبر اور ذہنی مشقت کا ثبوت دیا اور داستان امیر حمزہ کی صورت میں اردو زبان کو اتنا ثروت مند کیا کہ مغرب کے فکشن میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ مغربی لوگ ہمارے اس تخلیقی سرمائے پر انگشت بدنداں نظر آتے ہیں کہ برصغیر میں داستان امیر حمزہ کی چھیالیس جلدیں لکھی گئیں، جو نہ صرف لکھے جانے تک محدود رہیں بلکہ انھیں چھپائی کے عمل سے بھی گزارا گیا۔

ہم بلا شبہ اپنے اس سرمائے پر فخر کر سکتے ہیں۔ بیسویں صدی میں اردو ادب، جو اپنے آغاز ہی میں نظم و نثر کے متنوع اسالیب اپنے دامن میں سمیٹ چکا تھا، ایک نئے بہلاوے میں آ گیا۔ وہ بہکاوہ ترقی پسند تحریک کی صورت میں تھا، جو ہمارے کئی دماغوں کو چاٹ گئی۔ ٹھیک ہے اس بات کی بہت اہمیت ہے کہ مزدور کو اور پسماندہ طبقوں کو ان کا حق ملنا چاہیے مگر یہاں تو یہ طبقہ اتنا غالب نظر آتا ہے کہ بیسویں صدی کے ادیب آدھی صدی اسی لکیر کو پیٹتے رہے اور ایک طرح سے اکہری سوچوں کے کارخانے بناتے رہے۔ ادب میں نئے خیالات کا دخل بہت ہی کم رہا۔ اور نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ شاعری تو بہت کی جا رہی ہے، اس کے برعکس فکشن اتنا نہیں۔ اس میں محنت نہ کرنے کا عمل دخل زیادہ ہے کہ شاعری تو آسانی سے کہیں بھی بیٹھ کر کی جا سکتی ہے، نثر کے لیے پورا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ تو یہ عوامل بنے کہ فکشن تو زبان میں پہلے ہی کم تھا چہ جائیکہ فکشن میں تجربات کیے جاتے طلسمانہ کا حامل فکشن بنایا جاتا۔

اصل میں ہماری ذہنی تربیت ہی ان خطوط پر کی گئی کہ پڑھتے ہوئے جہاں بھی ذہن کو تھوڑی سی مشکل سے گزرنا پڑے، ہم وہ کتاب فوراً بند کر دیتے ہیں نتیجتاً ہمارا ادب سطحی خیالات کا ایک ہیولا سا بن گیا، جس میں انسانی جذبات اور

تصورات کی پرکھ کے ریاضیاتی فارمولے نظر آتے ہیں۔ ریاضی بھی چیزوں کو منطق دیتی ہے مگر یہاں وہ معروضیت نہیں بلکہ جذبات کی الجبریائی تعبیریں زیادہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔

ہمارے اذہان آسانیاں تلاش کرتے ہیں جبکہ طلسمانہ میں بعض اوقات بہت غور کرنا پڑتا ہے تب کہیں آپ فن پارے سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں ۔ اس لیے نتیجہ صفر ہے ۔ ہمارا معاشرہ ،جس میں انتشار جس تیزی سے وارد ہوا ہے،سجھاؤ سلجھاؤ کی طرف جاسکتا ہے تو وہ ایک تجزیے کا متقاضی ہے۔ایک غیر جانبدار تجزیہ۔طلسمانہ تجزیہ ہی تو ہے۔ ہاں اس میں حقیقت کا عمل دخل اس طرح نہیں جس طرح ترقی پسند ادب میں ہوتا ہے، اس کے برعکس طلسمانہ نگار لاشعوری طریقے سے معاشرتی ناہمواریوں پر نشتر زنی کرتا رہتا ہے۔اس کی مثال اردو میں لکھا جانے والا طلسمانہ فکشن کا سرمایہ ہے جس میں کرشن چندر ایک گدھے کی مدد سے انتظامی ناہمواریوں کی سمت نمائی کرتے نظر آتے ہیں۔

ای ایم فاسٹر نے اپنی کتاب Aspects of the novel میں طلسمانہ کو انسانی اور غیر انسانی موجودات میں تطابق کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ فاسٹر کا خیال ہے کہ ناول دو چیزوں کا مجموعہ ہے: ایک انسانی کردار دوسرا غیر انسانی موجودات۔ ظاہر ہے ان دو چیزوں کے ملنے سے ہی کوئی فن پارہ وجود میں آئے گا۔طلسمانہ ان دونوں عناصر کو آپس میں ملاتا ہے۔ ایک کردار حقیقت میں اگر کوئی تقریر کر رہا ہوتا ہے، جو سماجی حقیقت نگاری سے متعلق ہوتی ہے۔خیال کی رو میں اچانک وہ کسی اور ہی اقلیم میں پہنچ جاتا ہے اور سامعین، جو اس کی تقریر سن رہے ہوتے ہیں، اس اچانک تبدیلی میں تخیل کی سطح پر کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ایک طلسمی دنیا میں جہاں سب تبدیلیاں غیبی طاقتوں کے زیر اثر سرزد ہو رہی ہوتی ہیں۔ یہی طلسمانہ ہے خیال اور حقیقت کا تال میل۔یعنی اگر آپ ایک چیز کے بارے میں سوچنے کی حد تک تو حقیقت کے اسیر رہیں مگر جب اس کا مادی وجود دیکھنے کی خواہش جنم لے تو اسے مجسم نہ دیکھ سکیں۔

> ''اس لیے آیئے ہم ''فنتاسی'' کی جانب سے ہوا ، پانی، پہاڑ، کیڑے مکوڑے، حافظہ کی فروگزاشت، تمام زمانی واقعات و اتفاقات،ہنسی مذاق اور موت کی سرحد سے اس طرف بسنے والے تمام تر موجودات کو مخاطب کریں'' (۱۸)

ایک مختلف زاویے سے ہم دیکھیں تو ہمارے خیالات طلسمانوی ہی تو ہیں۔ جو کچھ ہم اپنے دماغ میں سوچتے ہیں ضروری نہیں کہ وہ اسی طرح موجود بھی ہو۔بعض صورتوں میں کامیابیاں بھی نصیب ہو جاتی ہیں۔تمام سائنس دان جب اپنے ذہن میں کسی ایجاد کا خاکہ تیار کرتے ہیں تو خاکہ ایک طلسمانہ ہی ہوتا ہے۔ طیارے کا تصور کہاں سے آیا؟ ظاہر ہے سائنس دانوں نے پرندوں کو اڑتے ہوئے دیکھا تو یہ تمنا پیدا ہوئی کہ انسان بھی فضا میں اڑ سکتا ہے۔ پھر کیا تھا۔ اس پر تجربات کیے اور اب ہم سالوں کے فاصلے دنوں میں طے کر لیتے ہیں۔ ایک حوالے سے تمام علوم ٹھوس شکل میں آنے سے پہلے واہمے ہی تو تھے۔ان واہموں کو انسانوں نے سخت محنت کے بعد حقیقت کا پیرہن دیا۔حقیقت اپنی اصل میں کیا ہے، اس کا کوئی ریاضیاتی فارمولا آج تک سامنے نہیں آیا۔انسانی علوم کی دنیا میں طلسمانہ ہو یا کوئی اور صنف، سب کچھ انسان کو سہولت پہنچانے کی کوششوں سے وابستہ ہے کہ کس طرح زندگی کی مشکلات پر فتح حاصل کی جائے اور زندگی گزارنے کے

عمل کو آسان بنا یا جائے۔طلسمانہ بھی اس جانب ایک قدم ہے۔طلسمانہ میں اور خاص طور پر داستان میں طلسمانہ ضروری نہیں کہ شہزادوں، شہزادیوں کی رومانی زندگی کی عکاس ہو اور ان کے سراپے، چہل، پھبتیوں کی حامل زبان رکھے ہوئے ہو۔ یہ سب کچھ ضروری نہیں بلکہ دو چیزیں طلسمانہ کو اور زیادہ ثروت مند کرتی ہیں اور وہ ہیں کرب اور دہشت، اس حوالے سے محمد سلیم الرحمٰن نے حنیف رامے پر تعارفی نوٹ لکھتے ہوئے بڑے بصیرت افروز نکات کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے۔وہ اپنے تعارف میں لکھتے ہیں۔(یہ تعارف اگرچہ حنیف رامے کی مصوری سے متعلق ہے لیکن اس میں طلسم ہوشربا، جو طلسمانہ کی ایک عمدہ مثال ،سے متعلق کچھ تصویریں تھیں جنھیں حنیف رامے نے بنایا تھا) خیر یہ معاملہ تھوڑا مختلف ہے ہمیں یہاں طلسمانہ سے متعلق خیالات سے علاقہ رکھنا چاہیے :

> ''طلسم ہوشربا، میری پسندیدہ کتاب ہے۔ پرانے وقتوں کی بات ہے کہ حنیف نے اس کے لیے کچھ تصویریں بنائیں اور جب وہ مصور ایڈیشن میری نظر سے گزرا تو مجھ پر بجلی سی گری۔ میں نے محسوس کیا کہ ان تصویروں کی پراز تعقید اور کابوسی سیرت کتاب سے کوئی مناسبت نہ رکھتی تھی۔میرے خیال میں طلسم ہوشربا کا تقاضا تھا کہ تصویریں بہت رومانی ہوں اور ان میں رنگین پنسلوں سے مدہم،خواب ناک بلکہ خوابیدہ رنگ بھرے جائیں حنیف کی تصویروں سے وہ خواب آلودہ اور تسکین دہ تناظر اتھل پتھل ہو گیا جو ہوشربا کے حوالے سے میرے ذہن میں محفوظ تھا جس تخلیقی آدمی نے ان تصویروں کو وجود بخشا تھا، وہ مجھے بہت اجنبی معلوم ہوا میں نے اس کے ہاتھوں دکھ اٹھایا تو اسے بد ذوق سمجھا۔ مدتوں بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ دہشت اور کابوس تو طلسمانہ کے خمیر میں شامل ہیں، خواہ بر ملا سامنے نہ آئیں اور حنیف کی بنائی ہوشربا، تصویریں موضوع سے بہت مشابہت رکھتی تھیں اور یہ احساس مجھے ابتدا میں نہ ہوا تھا۔ مدتوں بعد مجھے پتا چلا کہ ڈراؤنی اور ناگوار تصویریں میری آنکھوں کو بیدار کرتی تھیں۔'' (۱۹)

پتا چلا کہ دہشت بھی بیداری ہی کا ایک عمل ہے یہی وجہ ہے کہ مغرب میں ڈراؤنی فلمیں کثیر تعداد میں بنائی جاتی ہیں۔ ان میں اکثریت طلسمانوی عناصر کی حامل فلمیں ہوتی ہیں جو ہمارے اعماق میں چھپے خدشات، خوف اور زنگ کو اتارنے کا باعث بنتی ہیں۔یعنی طلسمانہ کو پڑھنے کی افادی صورتیں بھی ہیں جن سے ہم اپنے قلب و اذہان کی تربیت کر سکتے ہیں۔طلسمانہ ہمارے دماغی قفل کھول، بلکہ توڑ کر کہیں باطن میں تربیت کا ایک عمل لیے ہوئے ہے، جو کار خیر کے اس تسلسل میں فرد کے ہمراہ رہتا ہے۔

مگر ضرورت صرف تفہیم کی ہے اگر ہم ہی ڈرتے رہے تو شاید ہمیں بلوغت کو پہنچتے ہوئے بہت سارا سفر طے کرنا پڑے جس کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ بہت سا وقت پہلے ہی گزر چکا ہے۔طلسمانہ کے آغاز کے حوالے سے کوئی مبسوط دستاویز ایسی نہیں کہ ہم کہہ سکیں اس زمانے سے باضابطہ طور پر طلسمانہ کی تخلیق عمل میں آنا شروع ہوئی۔ایک حوالے سے دیکھا جائے تو اس کائنات کی معلومہ تاریخ میں، جس رات کسی فرد نے پہلا خواب دیکھا، وہیں سے طلسمانہ کا آغاز ہوا۔ قدیم انسان چونکہ پڑھا لکھا نہیں تھا اس لیے وہ اپنے اس عمل کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا، خواب اس کے لیے ایک مختلف دنیا تھی جس میں حقائق اور واہمے آپس میں اس طرح ملے ہوتے تھے کہ ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل تھا۔ قدیم

انسان یہ خیال تو کرتا ہوگا کہ وہی کچھ نہیں جو محض ہم جاگتے ہوئے دیکھتے ہیں بلکہ ایک اور بھی ایسی دنیا ہے جس سے ہمارا رابطہ عالم خواب میں ہوتا ہے۔جس میں ہمیں وہ کچھ حاصل ہوجاتا ہے جس کے بارے میں ہم کبھی حقیقتاً سوچ بھی نہیں سکتے۔اس کا ذہن خواب اور اصلیت کو الگ الگ سمجھنے لگا۔خواب اور حقیقت کی اس دوئی نے طلسمانہ لکھوانے کا آغاز کیا۔ انسانوں نے خود سے ایک ایسی دنیا بنانا شروع کردی جو کہیں خواب کے قریب کی دنیا تھی جس میں کئی ناآسودہ خواہشات کو آسودگی نصیب ہوئی۔کئی تشنہ آرزوئیں اور امنگیں پوری ہوئیں۔وہ معرکے جن کے سر کرنے کا انسان سوچا کرتا تھا وہ سر ہوئے۔ وہ جنگی سورما، جن کو شکست دینا ممکن نہ تھا طلسمانہ فکشن میں انھیں ہرانا ممکن ہوگیا۔

آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تخلیق کاروں نے حقیقت کے کرب سے بچنے کے لیے اور اس کا سامنا کرنے کے لیے اپنے لیے اور اپنے قارئین کے لیے ایسی دنیا کی تخلیق شروع کردی جس میں انسان داخل ہوکر اپنے لیے خوشی کا سامان کرسکتا تھا۔خوشیاں، جو ان کی زندگیوں سے کہیں روٹھ گئی تھیں حاصل کرسکتا تھا اور یہ سب کچھ طلسمانہ کی وجہ ہی سے ممکن ہوا ور نہ تو انسان تقدیر کے جبر سہتے سہتے ہمت ہار جاتا۔ قدیم انسان اور جدید انسان کی زندگی کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو اس میں خاصا فرق نظر آتا ہے۔ اس بُعد کی کئی سطحیں ہیں۔ پہلی سطح تو اس کی زندگی کا معیار ہے۔ قدیم انسان کے پاس معیار زندگی کو بہتر بنانے والے وہ لوازمات نہیں تھے جن کی بنیاد پر جدید انسان بیزاری سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک بٹن دباتا ہے اور دنیا جہان کی معلومات ،تفریحات و آسائشات اسے اس کی چوکھٹ پر مل جاتی ہیں۔ قدیم انسان کے پاس یہ سب کچھ نہیں تھا، وہ زندگیاں ایک جیسی تھیں۔ یکسانیت سے پُر ایک ہی رخ کا سفر تھا، جسے سب مسافر طے کررہے تھے۔ان کی زندگیوں میں اگر کوئی تبدیلی واقع ہوئی بھی تھی تو درد اور کرب کی صورت میں، کسی آمر کے جبر سے تعبیر اس تبدیلی میں دکھ ہی دکھ تھا۔ایک طرف یکسانیت کی ماری بکھری اور ٹوٹی زندگی اور دوسری طرف اس پر دکھ کی ضربیں۔ فرد اس صورت حال سے ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ ہاں اس صورت حال میں اگر کہیں سے اس کا سکھ کا سامان ہوتا ہے تو وہ خوابوں کی صورت میں۔خواب ڈھارس بندھاتے ہیں۔خواب تسلی بن جاتے ہیں اور انسان راحت محسوس کرتا ہے۔

ان خوابوں نے قدیم لکھنے والوں کو زبان دی جس کی بنیاد پر ان میں تخلیق کا بیج پروان چڑھا۔ظاہر ہے آمر خواہ کتنا ہی ظالم کیوں نہ ہو، کسی کو اپنے جبر کی وجہ سے خواب دیکھنے سے نہیں روک سکتا۔ یہ خواب کی دولت فرد کے ساتھ ہمیشہ رہتی ہے۔ ادب کی ماہیت کو بہ نظر تعمق دیکھا جائے تو یہ خواب ہی تو ہے۔ تبدیلی کا خواب، دنیا کو خوبصورت دیکھنے کا خواب، دنیا کو تبدیل کرنے کا خواب، طلسمانہ بھی انھی خوابوں سے بھرا ہوتا ہے۔ یہ بھی انسان کے باطن کی گہری سطحوں کو چھوتا اور ٹٹولتا ہے ۔ ہم طلسمانہ اور ادب کو الگ الگ نہیں کر سکتے۔ ادب معاشرتی بگاڑ کی طرف سمت نمائی کرتا ہے، ان میں سلجھاؤ کی ترکیبیں بناتا ہے۔طلسمانہ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا ایک بے کنار ماجرا ہے۔ اس میں جو کچھ نظر آرہا ہے اس سے در پردہ بہت کچھ موجود ہے جس تک انسان کی ابھی رسائی نہیں ہوئی اور تھوڑی سی کوشش سے وہ ان مظاہر کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔

کسی بھی سطح پر اگر ہم کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو پہلے ہمیں اس مظہر سے واقفیت حاصل کرنا ہوگی۔ پہلے یہ جاننا ہوگا کہ تبدیلی کن سطحوں پر لائی جاسکتی ہے۔ تبدیلی کی نوعیت کیا ہے اور اسے کس طرح سلجھایا جا سکتا ہے۔ ادب اس معاملے میں ہماری مدد کرتا ہے اور طلسمانہ ان خواہشات کے لیے کہیں تخیل میں جگہ بناتا ہے۔ تخیل جو خوابوں کا گھر ہے جہاں ارمان پلتے ہیں اور بعض صورتوں میں دکھ بھی جنم لیتے ہیں۔ ہم ادب اور تخیل کو الگ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح تخیل کا

طلسمانہ سے گہرا تعلق ہے تو طلسمانہ اور ادب اپنی اصل میں ایک ہی ہیں۔طلسمانہ ادب ہے اور ادب طلسمانہ۔ ادب اور طلسمانہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہونے کے باوجود کہیں بہت دوری پر کھڑے ہیں۔ اس خیال کا زیادہ اطلاق اردو ادب پر ہوتا ہے۔ انگریزی ادب تو صدیوں سے طلسمانہ سے بھرا پڑا ہے۔اس کے برعکس ہمارا ادب اس عنصر سے یکسر خالی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔

مغرب کا طلسمانہ میں اس قدر دلچسپی لینا اس خیال کو مضبوط کر دیتا ہے کہ جدید دنیا کی ایجادات، نیا طرز زندگی، گلوبلائزیشن ، دنیا کا عالمی گاؤں بن جانا ایک جاندار پہلو ضرور ہے مگر انسان خواہ قدیم دنیا کا ہو یا جدید زمانے کا اس کی زندگی سے ہم طلسمانہ کو نکال نہیں سکتے۔ اگر نیند اس کے مقدر میں ہے تو وہ خواب بھی دیکھے گا اور جب خواب دیکھے گا تو اپنے دل میں کسی اور دنیا سے قربت محسوس کرے گا جو اسے خود بخود طلسمانہ کے دیار میں لے جائے گا۔طلسمانہ کا فی زمانہ اردو کے ادب سے خالی ہونا ہماری ذہنی کیفیات کا عکس ہے کہ ہم کس طرح تخلیقی طور پر بنجر ہو چکے ہیں۔حقیقت کے بیان سے ہمارا ادب بھرا پڑا ہے اور حقیقت بھی اکہری حقیقت نگاری مگر جہاں بھی دماغ سے اختراع کا معاملہ سامنے آتا ہے تو ہمارے تخلیق کار کراہتے نظر آتے ہیں۔ شاید وہ محنت کرنا ہی نہیں چاہتے۔ظاہر ہے ان کے مقاصد اگر کم مشقت سے پورے ہو رہے ہیں اور انہوں نے قارئین کو اپنی ڈگر پر چلالیا ہے تو پھر خیر ہی خیر ہے۔ہمارا ادب اگر محدود تصورات کو لیے ہوئے ہے تو اس کی وجہ بھی ہم خود ہیں۔ انگریز تو آ کر اردو میں نہیں لکھیں گے ہمیں خود ہی کچھ کرنا ہوگا اور جدید رویوں کو قبول کرنا ہوگا۔ برصغیر میں داستانی ادب اگر نظر آتا ہے اور وہ بڑی حد تک طلسمانہ کا حامل ہے تو اس کی وجہ وہ نواب اور رؤسا ہیں جو وقت گزارنے کے لیے داستانیں سنتے تھے۔صرف نواب اور رؤسا ہی داستانیں نہیں سنتے تھے۔ بوستانِ خیال کے شروع میں میر تقی خیال نے جو لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ داستان گو چائے خوانوں میں بھی داستان سناتے تھے۔ اس لیے داستان گوؤں پر واجب تھا کہ وہ کچھ نیا گھڑیں اور نوابین کو سنائیں۔ دوسرے حوالے سے لکھنؤ کے لوگوں کا عام رجحان بھی تفریح کی طرف تھا۔ آصف الدولہ کی عنایات کی وجہ سے لکھنؤ میں زندگی اپنے جوبن پر تھی، آج کے زمانے کی طرح ڈش انٹینا اور کیبل تو تھے نہیں۔لوگ داستانیں سن کر خود کو مصروف رکھتے تھے۔ اس زمانے کی داستانیں نہ چھپنے کا بڑا سبب یہ تھا کہ اٹھارھویں صدی تک کوئی چھاپہ خانہ نہیں تھا۔ جو کچھ سنایا جاتا تھا وہ اکثر رزق ہوا ہو جاتا تھا۔قلمی نسخوں کی صورت میں محفوظ ہو جاتا تھا۔

انیسویں صدی میں جب چھاپہ خانے عمل میں آئے تو ان قصوں کے چھپنے کا آغاز ہوا۔ باغ و بہار، آرائش محفل (قصہ حاتم طائی) مذہب عشق (قصہ گل بکاؤلی)، فسانہ عجائب چھپ کر سامنے آئے۔ طویل داستانیں شائع نہیں ہوئیں۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں بڑے داستان گو موجود تھے لیکن ان سے کسی نے داستان نہیں لکھوائی۔داستانوں کی چھپائی کے حوالے سے کہیں انقلابی کام نظر آتا ہے تو مطبع نول کشور کا قیام ہے۔اس مطبع نے چھیالیس ضخیم جلدوں کی صورت میں داستان امیر حمزہ چھاپی جو طلسمانہ کے عناصر سے بھرا ہوا ہے۔ بوستان خیال ایک اور داستانی سلسلہ تھا۔ یوں جو داستان گو تھے وہ داستان نویس بن گئے۔نول کشور نے صرف تین داستان گوؤں کا کام چھاپا، باقی لوگوں کو نظر انداز کر دیا۔ اور اب بھی رام پور کے کتب خانوں میں داستان کا بڑا سرمایہ مدونین کا انتظار کر رہا ہے۔

طلسمانہ کے ان مباحث میں سب سے دلچسپ بات جو قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرواتا ہے وہ یہ ہے کہ آج کی دنیا عقل کی دنیا ہے اس کے باوجود ترقی یافتہ ممالک اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ جو بالخصوص سپر پاور بھی ہے وہاں

پچھلے پچاس برسوں میں طلسمانہ نگاروں نے اردو داستانوں کی طرز پر کئی کئی ضخیم جلدوں میں ناول لکھے ہیں جن کی فضا داستانوں سے مشابہت رکھتی ہے ثابت ہوا کہ آج بھی طلسمانہ انسانوں کی بڑی نفسیاتی ضرورت پوری کرتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ سہیل احمد خاں، محمد سلیم الرحمٰن، منتخب ادبی اصطلاحات، لاہور: جی سی یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء، ص۹

۲۔ ایضاً، ص۱۴

3. K. Leguin, Ursla, Anthology of Fantasy Fiction, London, Cambridge University Press, 2005 ,P6

۴۔ محمد عمر میمن، (مترجم)، نوجوان ناول نگار کے نام خط، کراچی: شہرزاد، ۲۰۱۰ء، ص۱۵

۵۔ ایضاً، ص۷۶

۶۔ ایضاً، ص۸۰

۷۔ ایضاً، ص۹۸

۸۔ حقی، شان الحق، (مرتب)، اوکسفرڈ اُردو انگلش ڈکشنری، کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۵ء، ص۵۶۵

۹۔ کلیم الدین احمد، (مدیرِاعلیٰ)، جامع انگلش اُردو ڈکشنری، دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ زبانِ اُردو، ۱۹۹۸ء، ص۵۱۳

۱۰۔ جمیل جالبی، (مرتّب)، قومی انگریزی اُردو لغت، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۲ء، ص۲۴۷

11. S.Rabkin, Fantastic worlds, New York, oxford University press, 1979, P3

12. E.M kirk palric, chamber's 20th century Dictionary, Singapore, chamber's., 1983, P456

13. Oxford, The oxford English Dictionary, 2nd Edition, Claendon Press, 1989, P723

14. Paul. Procter, Cabmridge International Dictionary of English, London, Cambridge University Press, P503

15. Martin Gray, "A Dictionary of Literary Terms", Hong Kong: Langmans York Press, 2001, P84

16. Hugh Holman&William Harmon, A Hand Book of Literature, USA, MacMillan, Publishing Company, 1986, P198

17. Frederick Ungar & Lina mainiero, Encyclopedia of world Literature in 20th Century, New York, Frederick unger Publishing co., vol. 4, 1976, P101

۱۸۔ قاسمی، ابوالکلام، (مترجم)، ناول کا فن، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاوس، ۱۹۹۲ء، ص۹۴

۱۹۔ محمد سلیم الرحمٰن، (س ن)، محمد حنیف رامے، مشمولہ سویرا شمارہ ۳۷، ص۳۵